تفہیم القرآن

الصّافّات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ والصّافّات سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور طرزِ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکّی دور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ متوسط کے بھی آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدّت کے ساتھ برپا ہے اور نبیؐ و اصحابِ نبیؐ کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزاء کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدّت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفارِ مکّہ کو نہایت پُرزور طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انہیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبر، جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو، تمہارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آجائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشکل ۴۰۔۵۰ صحابہ مکّہ میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ اِن حالات میں ظاہر اسباب کو

دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخر کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مٹھی بھر بے سر و سامان جماعت کو نصیب ہو گا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکّے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکّہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آ گیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر مختصر اور دلنشین دلائل دیئے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، اِن گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کس قدر شاندار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے، کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصّے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اِس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سُنا کر اُنہیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے۔ اور اُسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ آیات سنا کر خوشخبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آ رہا ہے اُن پر گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہی کو نصیب ہوگا، اور باطل کے وہ علمبردار جو اس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انہی کے ہاتھوں مغلوب و مفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی خولی تسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم، پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم جو کلامِ نصیحت سنانے والے ہیں[1]، تمہارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے[2] ـــــ وہ جو زمین

---

[1] مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، قَتَادَہ، مسروق، سعید بن جُبَیر، عِکرِمہ، مجاہد، سُدّی، ابن زید، اور ربیع بن انس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں "قطار در قطار صف باندھنے" کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اسی مضمون کا اعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔

"ڈانٹنے اور پھٹکارنے" سے مراد، جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار صرف لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ

اور آسمانوں کا اور تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں[۳] کا مالک[۴]۔

انسانوں پر وہ حوادث طبیعی اور آفاتِ تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

"کلامِ نصیحت سنانے" سے مراد یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امرِ حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادثِ زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اُن تعلیمات کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں، اور اُن الہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۲؎ یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے بُرے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاددہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا "الٰہ" صرف ایک ہی ہے۔

"الٰہ" کے لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے وہ معبودِ حقیقی الحقیقت اس کا مستحق ہو کہ اس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے "الٰہ" کا ترجمہ "معبودِ حقیقی" کیا ہے۔

۳؎ سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رب المشارق والمغارب کے الفاظ بھی آئے ہیں (المعارج ۴۰)

۴؎ ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہی انسانوں کا اصلی معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے

ہم نے آسمانِ دنیا[۵] کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے[۶]۔ یہ شیاطین ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب

کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مربّی و پروردگار) کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا بھی جس کے اختیار میں ہے، اس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلافِ عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہی نہیں ان کے آگے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انہی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔

۵؎ آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے، وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ "سماء" کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اس کے ہم معنی الفاظ عالمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

۶؎ یعنی یہ عالم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور سیارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (SPHERE) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن

ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد و حساب خطے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اُن گوناگوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جنوں کے لیے بھی عالم بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

۷۸ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان سے رجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انہیں ہر طرح کی خبریں لا لا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپ نے قرآن مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپ کے مخالفین نے فوراً آپ کے اوپر کاہن کی پھبتی کس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالم بالا سے کچھ سُن گُن لے کر ان کے پاس آ جاتا ہے اور یہ اُسے وحیِ الٰہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی عالم بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اِس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ (یعنی گروہِ ملائکہ) کی باتیں سن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بھنک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اُسے لیکر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اُس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۵۰۰ تا ۵۰۲)

اب اِن سے پوچھو، اِن کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟[۸]
اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے[۹]۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور

۸ یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

۹ یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔

لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانِ اول کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟

یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے[۱۰]، بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو[۱۱]۔

بس ایک ہی جھڑکی ہو گی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے[۱۲]۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے ۔۔۔ یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے[۱۳]۔ (حکم ہو گا) گھیر لاؤ سب ظالموں[۱۴] اور ان کے ع

---

[۱۰] یعنی عالم طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مُردے اٹھیں گے، عدالت ہو گی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

[۱۱] یعنی اللہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آ گئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اٹھا کھڑا کریگا۔

[۱۲] یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہو گا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہو گی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے اس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ لگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

[۱۳] ہو سکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہلِ ایمان کہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہو سکتا ہے کہ میدانِ حشر

ساتھیوں کو اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے،[۱۶] پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ اور ذرا انہیں ٹھیراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔" کیا ہو گیا تمہیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ اے یہ تو اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں![۱۷] اس کے بعد یہ

کا سارا ماحول اُس وقت زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خود انہی لوگوں کا دوسرا ردِ عمل ہو۔ یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے، اب آ گئی تمہاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آ گیا۔

۱۴؎ ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

۱۵؎ اصل میں لفظ "ازواج" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

۱۶؎ اس جگہ معبودوں سے مراد دو قسم کے معبود ہیں۔ ایک، وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کریں۔ دوسرے وہ اصنام اور شجر و حجر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبود تو خود مجرمین میں شامل ہونگے اور انہیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انہیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنہیں دنیا میں پُوجا تو گیا ہے مگر خود ان کا اپنا ایسا ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیاء اور اولیاء۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ اُن معبودوں میں شامل نہ ہونگے جنہیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۷؎ پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔ اور دوسرا فقرہ اُن عام حاضرین کی طرف رُخ کر کے

ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے "تم ہمارے پاس سیدھے رُخ سے آتے تھے"[۱۵] وہ جواب دیں گے "نہیں، بلکہ تم خود

فرمایا جائے گا جو اُس وقت جہنم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہونگے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اُس وقت حالت کیا ہوگی۔ بڑے بڑے بیکٹر مجرمین کے کس بل نکل چکے ہونگے اور کسی مزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنم کی طرف جا رہے ہونگے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہونگے اور درباریوں میں سے کوئی "اعلیٰ حضرت" کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتح عالم انتہائی ذلت کے ساتھ چلا جا رہا ہوگا اور اس کا لشکرِ جرار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دیگا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گرو جی یا ہولی فادر واصل بجہنم ہو رہے ہونگے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہوگی کہ حضرت والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کس مپرسی کے عالم میں جہنم کی طرف رواں دواں ہونگے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں اُن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انہیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہوگی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے، اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

۱۵؎ اصل الفاظ ہیں کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ "تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے"۔ یمین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لیے ہم تمہارے فریب میں آ گئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ آخر کار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے۔"[۱۹]

اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔[۲۰] ہم مجرموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔[۲۱] اب ان سے کہا جائے گا کہ تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو۔ اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔

مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے۔ ان کے لیے جانا پہچانا رزق ہے۔[۲۲]

---

[۱۹] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، سورۂ سبا، حواشی نمبر ۵۱-۵۲-۵۳

[۲۰] یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیروؤں کا یہ عذر مسموع ہوگا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں گمراہ کیا گیا تھا۔ اور نہ پیشواؤں کی اس معذرت کو قبول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہ راست کے طالب نہ تھے۔

[۲۱] رسولوں کی تصدیق کے تین معنی ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اُس رسول کے ماننے والوں کے لیے اُس کے خلاف تعصب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ اُن تمام خبروں کا صحیح مصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اُس کے بارے میں دی تھیں۔

[۲۲] یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جا چکی ہیں، جس کے ملنے کا انہیں یقین ہے، جس کے متعلق انہیں یہ بھی اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لگا ہوا نہیں ہے کہ کیا خبر،

ہر طرح کی لذیذ چیزیں[۲۳]۔ اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ شراب[۲۴] کے چشموں[۲۵] سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے[۲۶]

ملے یا نہ ملے۔

۲۳؎ اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزاء کی جگہ دوسرے اجزاء غذا کے ذریعہ فراہم کیے جائیں، کیونکہ اُس ابدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہونگے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے، اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے اُن کھانوں کے لیے "فواکہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کے بجائے تلذّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

۲۴؎ اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف کاس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو اسے کاس نہیں کہتے۔ کاس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

۲۵؎ یعنی وہ شراب اُس قسم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلّوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے بلکہ وہ قدرتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۂ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ "اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہونگی"۔

۲۶؎ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کریگا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے: وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ "اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے اُن کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چھپے ہوئے موتی" (الطور آیت ۲۴)۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا "اور

چکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔[۲۷] اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی،[۲۸] خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہونگی،[۲۹] ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی۔[۳۰]

ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیئے گئے ہیں"۔ (الدھر، آیت ۱۹)۔ پھر اس کی مزید تفصیل حضرت انسؓ اور حضرت سَمُرہ بن جُندُبؓ کی اُن روایات میں ملتی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ "مشرکین کے بچے اہلِ جنّت کے خادم ہونگے" (ابوداؤد طَیالسی، طَبرانی، بَزّار)۔ یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سنِ رشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنّت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچّوں کے والدین جنّتی ہونگے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنّتی نہ ہونگے۔ سو اُن کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جنّت کے خادم بنا دیئے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری اور عمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین۔ نیز رسالہ ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۷ء)

۲۷؎ یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبُو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو متاثر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اس کے بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اُترتا ہے تو آدمی خمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اوّل فول بکتا ہے اور عربدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سُرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنّت کی شراب میں سُرور تو پوری طرح ہوگا (لذّۃ للشاربین)، لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا، "دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا، کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا واقعی جب ہم مر چکے ہونگے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟" یہ کہہ کر جونہی وہ جھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا "خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔[۳۲] اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو

۲۸؎ یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

۲۹؎ بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لیے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کی رفیقِ حیات بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں کَاَنَّھُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ۔ گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں۔ ان الفاظ کی مختلف تعبیرات اہلِ تفسیر نے بیان کی ہیں مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضورؐ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اُس جھلی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گودے کے درمیان ہوتی ہے (ابن جریر)۔

۳۱؎ یعنی تم بھی ایسے ضعیف الاعتقاد ہو کہ زندگی بعد موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھے۔

۳۲؎ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کی سماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمانے کی ہوگی۔ جنت میں بیٹھا ہوا ایک آدمی جب چاہتا ہے کسی ٹیلیویژن کے آلے کے بغیر یوں ہی جھک کر ایک ایسے شخص کو دیکھ لیتا ہے جو اس سے نہ معلوم کتنے ہزار میل کے فاصلے پر جہنم میں مبتلائے عذاب ہے۔

ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آچکی ؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا ؟[۳۳]"

یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم[۳۴] کا درخت ؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے[۳۵]۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر[۳۶]۔ جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہُوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد ان کی واپسی اُسی آتشِ دوزخ

پھر یہی نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان کسی ٹیلیفون یا ریڈیو کے توسط کے بغیر براہِ راست کلام بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے طویل فاصلے سے بات کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات سنتے ہیں۔

۳۳؎ اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ اپنے اُس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت و استعجاب اور فخر و مسرت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطب نہیں ہوتا اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنتی شخص اُس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کلفتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مجھے حیاتِ جاوداں نصیب ہو چکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اٹھتا ہے کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں ؟

۳۴؎ زقوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے، بُو ناگوار ہوتی ہے، اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو

کی طرف ہوگی۔[۳۷] یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقشِ قدم پر یہ دوڑ چلے۔[۳۸] حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور اُن میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے ع ۲

ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

۳۵ یعنی منکرین یہ بات سن کر قرآن پر طعن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزاء کا ایک نیا موقع پا لیتے ہیں۔ وہ اس پر ٹھٹھا مار کر کہتے ہیں، لو اب نئی سنو، جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اُگے گا۔

۳۶ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زقوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ دراصل یہ تخییلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر ہر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوبصورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں، وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں، وہ چڑیل ہے یا بھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے، وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئت کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

۳۷ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ جب بھوک پیاس سے بے تاب ہونے لگیں گے تو انہیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زقوم کے درخت اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہو جائیں گے تو انہیں دوزخ کی طرف واپس لایا جائے گا۔

۳۸ یعنی انہوں نے خود اپنی عقل سے کام لے کر کبھی نہ سوچا کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر ہو لیے جس پر دوسروں کو چلتے دیکھا۔